ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی*

پروفیسر نجات اللہ صدیقی: ایک فکری مسافر

(۱)

اکتوبر ۲۰۲۲ء کے آخری عشرہ میں راقم شدید بیمار پڑا تو تقریباً پورے نومبر تک علالت کا سلسلہ دراز ہو گیا۔ صاحب فراش ہونے کی وجہ سے سوشل میڈیا سے بھی بالکل کٹ کر رہ گیا۔ ۱۲/ نومبر کی دوپہر میں کشمیر سے بھائی سہیل بشیر کا فون آیا تو یہ اطلاع مل سکی کہ آج صبح پروفیسر نجات اللہ صدیقی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی ۹۱ سال کے تھے، رعشہ کے مریض اور کیلی فورنیا امریکا میں اپنے بچوں کے پاس مقیم تھے۔ گو کہ کافی دنوں سے ان کی بیماری کی خبریں آ رہی تھیں، جن کی وجہ سے یہ خبر بالکل بھی غیر متوقع نہ تھی، تاہم ایک بڑے آدمی کی رحلت سے یک گونہ یتیمی اور قحط الرجال کا احساس اور شدید ہو گیا۔ راقم خاک سار کے پروفیسر نجات اللہ صاحب مرحوم سے بڑے نیاز مندانہ تعلقات تھے۔ کئی بار انھوں نے فون کر کے میرے بعض مضامین پر مبارک باد دی اور کئی بار تنبیہ بھی فرمائی، اور بعض نزاکتوں اور فروگذاشتوں کی طرف توجہ بھی دلائی۔ کئی موقعوں پر انھوں نے عصر حاضر کو سمجھنے کے لیے معاون مراجع کی نشان دہی کی۔ ان سے ملاقاتوں، گفتگوؤں اور تحریروں سے تاثر کی یادوں کا ایک سلسلہ تھا جو ذہن کی اسکرین پر آ رہا تھا۔ بہر حال اس وقت تو ایک مختصر سی فیس بک پوسٹ لکھ دی تھی، لیکن ان کا حق تھا کہ ان کے اوپر تفصیلی مضمون لکھا جائے۔ اسی احساس کے تحت اس تاثراتی تحریر میں نجات صاحب کی شخصیت کے بعض اچھوتے گوشوں کو سامنے لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی ہمارے گھرانے اور ماحول میں کوئی غیر معروف آدمی نہ تھے۔ لوگ عام طور پر ان کو

* ریسرچ ایسوسی ایٹ، مرکز فروغ تعلیم و ثقافت مسلمانان ہند، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

اسلامی معاشیات کے ایک ماہر کی حیثیت سے جانتے تھے۔ اور جماعت اسلامی سے وابستہ یا اس سے قربت رکھنے والے ان کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے۔ میرے بڑے بہنوئی ہاپوڑ شہر کے حافظ ریاست علی، جو جماعت کے بڑے والہ اور شیدا تھے، غالباً میرٹھ شہر میں منعقد جماعت کے کسی اجتماع کا حال بیان کرتے تھے کہ:

''اسٹیج پر ایک سوٹڈ بوٹڈ ہلکی ڈاڑھی والا لمبا سا ایک لڑکا ایک پینل ڈسکشن میں بڑے اہم سوالوں کا جواب فر فر اور بڑے معقول اور سائنٹیفک طریقہ سے دے رہا تھا، معلوم ہوا کہ ثانوی درس گاہ رامپور سے پڑھ کر نکلا ہے اور علی گڑھ سے ایم اے کر رہا ہے۔ اس کا نام نجات اللہ صدیقی ہے۔''[1]

حافظ صاحب مرحوم خود بڑی مدلل اور مرصع گفتگو کرتے تھے، نجات صاحب کے بارے میں ان کا یہ تاثر ہمیشہ ذہن میں محفوظ رہا، حالاں کہ ڈاکٹر نجات اللہ صاحب سے دید و شنید تو بہت بعد میں ہوئی، مگر ان کی تحریریں گاہے بگاہے مطالعہ میں آتی رہیں: ''اسلامی نشاۃ ثانیہ کی راہ''، ''تحریک اسلامی عصر حاضر میں''، ''مدارس اسلامیہ اور عصری تقاضے''، ''اسلام اور نظریۂ ملکیت'' اور ''انشورنس اسلامی معیشت میں'' وغیرہ۔ اس کے علاوہ ماہنامہ ''زندگی نو'' میں اسلام اور تشدد اور دوسرے مقالات و مضامین پڑھنے کو ملے۔ اور بہت بعد میں راقم کے کرم فرما جناب امین عثمانی مرحوم نے ان کا گراں قدر کتابچہ ''فکر اسلامی: بعض توجہ طلب مسائل'' شائع کرایا تو وہ پڑھنے میں آیا۔ نیز ان کی کتاب ''اسلام، معاشیات اور ادب خطوط کے آئینہ میں'' کے ذریعے سے ان کی فکر سے بھرپور آشنائی ہو گئی۔

۱۹۳۱ء کو گورکھپور کے ایک گاؤں پڈرونا میں نجات اللہ صدیقی کی پیدائش ایک متوسط درجہ کے دین دار گھرانا میں ہوئی۔ گورکھپور شہر میں بھی ان کے خاندان کا آبائی مکان موجود ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں راقم کا تعلق ''کل ہند طلبہ تحریک'' سے ہوا اور اس سلسلہ میں گورکھپور جانا ہوا تو نجات صاحب کے آبائی گھر کی ہم لوگوں نے زیارت کی، جس میں اس وقت ان کے بھتیجے ڈاکٹر احمد اللہ صدیقی (مقیم الینوائے امریکا) کے اعزارہ رہے تھے۔ نجات اللہ صاحب نے ہائی اسکول، اسلامیہ انٹر کالج اسکول گورکھپور سے پاس کیا اور اسی زمانہ میں جماعت کے اکابر اور لٹریچر سے ان کا واسطہ پڑا۔ اس زمانہ میں ان کے یار غار عبد الحق انصاری تھے جو بعد میں امیر جماعت بنے۔ مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ کا رخ کیا اور بی اے میں داخلہ لیا، لیکن جماعت سے شدید طور پر متاثر ہو جانے کی وجہ سے یہ نوجوان موجودہ سیکولر نظام تعلیم سے نالاں تھے۔ چنانچہ نجات اللہ صاحب اور ان کے کچھ اور

۱۔ زبانی بیان۔

ساتھی رامپور میں جماعت کے مرکز پہنچے اور اکابرین جماعت مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی اور مولانا صدرالدین اصلاحی وغیرہم سے ان لوگوں نے بڑے اصرار سے عرض کیا: ''ہم اپنے کیریئر کو خیر باد کہہ کر آئے ہیں، آپ ہمارے لیے عربی اور اسلامی علوم کے پڑھنے کا نظم قائم کریں''۔ چنانچہ ان لوگوں کے پیہم اصرار اور شوق کے باعث ''ثانوی درس گاہ'' کا قیام عمل میں آیا، جو بالکل نیا تجربہ تھا اور ۱۹۵۰ء-۱۹۶۰ء تک قائم رہی اور اس سے غالباً دو بیچ پڑھ کر نکلے۔ پہلے بیچ میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، عبدالحق انصاری (سابق امیر جماعت اسلامی ہند) قاضی اشفاق (مقیم سڈنی) فلسفی راؤ عرفان احمد خان (جنھوں نے بعد میں انگریزی میں قرآن کی طبع زاد تفسیر ''Understanding The Quran'' لکھی[۲] اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی اور مولانا وحیدالدین خاں تھے۔ پانچ سال تک عربی زبان اور اسلامی علوم پڑھنے کے ساتھ ہی نجات صاحب نے مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں بھی چھ مہینے گزارے، اور وہاں رہ کر مولانا اختر احسن اصلاحی تلمیذ رشید مولانا حمیدالدین فراہی سے استفادہ کیا۔ ثانوی درس گاہ میں ان حضرات کے اساتذہ میں مولانا صدرالدین اصلاحی، مولانا ابواللیث اصلاحی، مولانا جلیل احسن ندوی اور مولانا حامد علی مظاہری وغیرہم تھے۔

ثانوی درس گاہ سے فارغ ہونے کے بعد ان حضرات کو جماعت مختلف ذمہ داریوں کے تحت کھپانا چاہتی تھی، جب کہ نجات اللہ صاحب کا نقطۂ نظر اور آگے پڑھنے اور اسلام کے احیا کے لیے علمی کام کرنے کا تھا۔ بہر حال اکابر جماعت اور ان نئے ولولوں سے سرشار جوشیلی طبیعت کے نوجوانوں کے نقطۂ نظر میں ہم آہنگی نہ ہو سکی تو نجات صاحب اور ان کے رفقا نے علی گڑھ کا رخ کیا اور اپنی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کی۔ علی گڑھ سے نجات صاحب نے معاشیات میں ایم اے اور پھر ۱۹۶۶ء میں ''نظریۂ نفع'' پر پی ایچ ڈی کی۔ پی ایچ ڈی کی تکمیل سے ایک سال پہلے ہی ان کو شعبۂ معاشیات میں لیکچرر شپ مل گئی تھی، اور پھر وہیں ریڈر ہو گئے۔ اُس زمانہ میں یونیورسٹیوں میں ایک شعبہ سے دوسرے متعلقہ شعبہ میں جانے کی سہولت حاصل تھی، چنانچہ نجات صاحب ۱۹۷۷ء میں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر ہوئے اور صدر شعبہ بھی رہے۔ سن ۱۹۷۸ء میں انھوں نے سعودی عرب کی کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ جوائن کر لی اور پھر سن ۲۰۰۰ء میں وہیں سے ریٹائرڈ ہوئے۔ یہ مدت ان کے علمی کاموں کے لیے بڑی زرخیز تھی، ان کی انگریزی اور اردو میں بہت ساری بنیادی اور مرجعیت رکھنے والی تحریریں اسی عرصہ میں شائع ہوئیں، یہاں تک کہ ۱۹۸۲ء میں اسلامی علمی خدمات پر ان کو فیصل ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

۲۔ اس پر انگریزی میں تبصرہ کے لیے ملاحظہ کریں: Milli Gazzet2011Jan 15-1۔

وہ بہت سارے علمی اداروں اور یونیورسٹیوں کے اہم شعبوں کے رکن رہے۔ کئی علمی مجلوں کے سرپرست اور مشیر رہے۔ اور ۲۰۰۱ء میں کیلی فورنیا یونیورسٹی کے فیلو بھی رہے۔[۳] ڈاکٹر نجات صاحب کی متعدد کتابوں کا ترجمہ عربی، ترکی، فارسی، انڈونیشی اور مالیزی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اور تقریباً ۴۹ کتابوں کے علاوہ انھوں نے مختلف موضوعات پر ۶۰ پیپرز لکھے جو حوالہ کے جرنلز اور تحقیقی رسائل میں شائع ہوئے۔ نجات اللہ صدیقی صاحب نے قیام مغرب کے دوران میں "Encyclopedia of Islamic Economics" کو بھی ایڈٹ کیا جو شائع ہو چکا ہے۔

جہاں سرسید علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر ایک دور ایسا بھی گزرا ہے، جب وہاں کی اکیڈمک فضا اور خاص کر شعبۂ تاریخ میں سرخوں کا بڑا دبدبہ رہا۔ ترقی پسندوں سے بھی آگے بڑھ کر کمیونسٹ طلبہ و دانش وروں نے اپنا بڑا اثر و رسوخ قائم کر لیا تھا۔ تاریخ، انگریزی، اردو اور بعض دوسرے شعبوں میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ اُس وقت نجات صاحب علی گڑھ میں تھے اور یہاں سے ایم اے یا پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں، عبدالحق انصاری، فضل الرحمٰن فریدی اور ابن فرید وغیرہ کو لے کر یونیورسٹی کے مختلف ہالوں میں طلبائی پروگرام کیے اور طلبہ تحریک کی یونٹیں قائم کیں۔ اسی طرح انھوں نے ادب میں ایک تعمیری تحریک یا اسلامی ادبی تحریک بھی شروع کی اور اس زمانہ میں اسلامی نقطۂ نظر سے کہانیاں اور افسانے بھی لکھے۔ نیز مقالات کے دو مجموعے بھی شائع کیے۔[۴] ادب کی تعمیری تحریک یا اسلامی ادبی تحریک کی ابتدا بھی انھوں نے طالب علمی کے زمانہ میں گورکھ پور سے ہی کر دی تھی۔ چنانچہ حلقۂ ادب اسلامی گورکھ پور سے شمس الرحمٰن فاروقی سمیت بہت سے لوگ وابستہ ہوئے تھے۔ بعد میں فاروقی اردو زبان کے بڑے ادیب اور دانش ور بن کر سامنے آئے۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے ۱۹۶۷ء میں اسلامی بینکنگ کو غیر سودی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے سودی بینک کاری کے متبادل کے طور پر علمی بنیادوں پر پیش کرنا شروع کیا۔ اور بتدریج اس کے عملی خط و خال بھی طے کیے۔ ماہنامہ ''زندگی نو'' اور ''چراغ راہ'' کراچی میں سلسلہ وار مضامین سے اس کی ابتدا ہوئی، جو بعد

۳۔ ملاحظہ ہو:

https://muslimmirror.com/eng/dr-muhammad-nejatullah-siddiqi-the-father-of-modern-islamic-banking/

۴۔ یہ دو کتابیں ہیں: ''اسلام اور فنون لطیفہ'' اور ''ادب اسلامی: نظریاتی مقالات''۔

میں ''غیر سودی بینک کاری'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ یوں ان کا پیش کردہ خاکہ منقح ہو کر اسلامی بینکنگ کے ایک مستقل نظام کی شکل میں سامنے آیا۔ بعد میں نجات صاحب اس کو اسلامی کے بجاے Participatory Banking کہنا پسند کرتے تھے، جیسا کہ جناب ایچ عبد الرقیب کو انگزیری میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے اظہار کیا ہے۔[۵] اس موضوع پر پھر اور علما اور اسکالروں نے بھی لکھنا شروع کیا، یہاں تک کہ اس کے عملی تجربات بھی دنیا میں ہونے لگے۔ چنانچہ آج دنیا میں بینکوں کی قریباً ۵۰۰ شاخیں غیر سودی بینکنگ کا تجربہ کر رہی ہیں۔[۶] پاکستان میں روایتی علما و فقہا میں مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ نے بھی اس رجحان کی حوصلہ افزائی کی اور خود اسلامی مالیاتی سرگرمیوں کی سرپرستی کی۔ البتہ پاکستان میں متشدد علما کا ایک طبقہ اس پوری محنت پر پانی پھیر ناضروری سمجھتا ہے اور اسلامی فائنانس یا اسلامی بینکنگ کے تصور سے ہی اس کو سخت الرجی ہے۔[۷]

ڈاکٹر نجات اللہ صاحب کی تحریروں کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر خان یاسر نے لکھا ہے:

''بات کی تہ تک پہنچنا اور علمی بحث کو آگے بڑھانے میں انھیں خاص درک حاصل تھا۔ وہ تکرار اور گھوم گھوم کر ایک ہی بات دہرانے کے قائل نہیں تھے۔ مثال کے طور پر اپنے ایک مقالے: Islamization of Knowledge, Reflections on Priorities میں وہ بحث کو موجودہ علوم کے اسلامائزیشن سے آگے لے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں عدل، احسان اور تعاون جیسی اسلامی قدروں کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے علمی تحقیق کی اساس اور طریق کار کو اسلامی مزاج سے ہم آہنگ کرنے کی وکالت کرتے ہیں۔... ان تراجم کی زبان ٹھوس، نثر شستہ اور رواں اور تحقیقی معیار مسلم ہے۔ مترجم نے قاری تک صرف مصنف کتاب کے استعمال کردہ الفاظ کے معانی منتقل نہیں کیے ہیں، بلکہ مصنف اور کتاب کے پورے سیاق سے قاری کو ہم آہنگ کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے، ساتھ ہی ترجمہ کردہ علمی کاوش کی علمی و تاریخی قدر بھی متعین کرتے چلے ہیں۔... اسی طرح قاضی ابو یوسف کی ''کتاب الخراج'' کے ترجمے میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے تقریباً ۷۵ صفحات پر مشتمل ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے، جس میں اس دور کا تاریخی پس منظر، قاضی ابو یوسف کے

۵۔ https://youtu.be/L9JXSvy7Nco۔

۶۔ https://youtu.be/L9JXSvy7Nco۔

۷۔ ملاحظہ ہو: مفتی تقی عثمانی، غیر سودی بینکاری، متعلقہ فقہی مسائل کی تحقیق اور اشکالات کا جائزہ شائع کردہ فرید بک ڈپو، دہلی انڈیا ۲۰۱۰ء۔

حالات زندگی، تصانیف کا اجمالی تعارف، مناقب و محاسن، معاصرین کی جانب سے کی جانے والی تنقیدوں کا محاکمہ اور اسلامی تاریخ میں ان کے علمی مقام کا تعین وغیرہ شامل ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے اس مقدمے میں ''کتاب الخراج'' کا اپنے موضوع پر دیگر معاصر کتب سے موازنہ اور اس کی علمی و تاریخی اہمیت، اس کے مختلف نسخوں، شرحوں، اور ترجموں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اسی طرح کتاب کی شروعات ہی میں درہم، مثقال، دینار، اوقیہ، صاع، وسق وغیرہ سکوں، اوزان اور پیمانوں کا تحقیقی تعارف بھی پیش کر دیا ہے تاکہ کتاب سے استفادے میں زمانی بُعد حائل نہ ہو سکے۔''[۸]

یاد رہے کہ ''العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام'' میں سید قطب نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں وہی نقطۂ نظر اختیار کر لیا ہے جو مولانا مودودی وغیرہ کا ہے۔ نتیجہ یہ تھا کہ علما کے حلقہ میں سید قطب کو بہت مطعون کیا گیا اور یہاں تک کہ اخوان دشمنی میں ناصر کی حمایت تک کی گئی۔[۹]

امانت علمی کی خاطر یہ بھی عرض کر دوں کہ نجات صاحب کی تمام آرا سے کلی اتفاق راقم کو بھی نہیں، مثال کے طور پر مولانا مودودی کی معروف اور متنازعہ فیہ کتاب ''خلافت و ملوکیت'' کے بارے میں ان کی رائے اور خاک سار کی رائے بالکل الگ ہے۔ وہ اس کتاب کو فلسفہ و تاریخ اسلامی یا تعبیر تاریخ اسلامی کے اعتبار سے مودودی صاحب کی چند اونچی تصنیفات میں شمار کرتے تھے[۱۰]، جب کہ راقم کو یہ کتاب نہ صرف علمی لحاظ سے بودی لگی، بلکہ سیدنا عثمان، سیدنا امیر معاویہ، سیدنا عمرو بن العاص اور سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں اس کی رکیک زبان کی وجہ سے اس سے رفض و تشیع کی بو آتی ہے (مزید دیکھیے: حاشیہ ۱۲)۔

ڈاکٹر نجات اللہ صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بہت پڑھتے تھے اور مستقل سوچتے تھے۔ ان کی کتاب ''مقاصد شریعت'' ہند میں شائع ہوئی تو ماہنامہ ''افکار ملی'' (جس کی ادارت ان دنوں خاک سار کر رہا تھا) میں ڈاکٹر عبد القادر لون کا تفصیلی تبصرہ شائع ہوا۔ اپنے تبصرہ میں لون صاحب نے شیخ ابن العربی کی

۸۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

https://wp.me/p7zTiB-g5i

۹۔ ملاحظہ ہو: مولانا مودودی کا خط نجات صاحب کے نام (اسلام، معاشیات اور ادب خطوط کے آئینہ میں، ص ۴۴، سلسلہ نمبر ۸)۔

۱۰۔ اسلام، معاشیات اور ادب، ص ۸۵، سلسلہ نمبر ۵۷۔

''فصوص الحکم'' کے حوالہ سے لکھا کہ شیخ نے اس میں ''مقاصد شریعت'' کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اس کے بعد جب نجات صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ یہ تبصرہ دیکھنے کے بعد انھوں نے ''فصوص الحکم'' بالاستیعاب دیکھی، مگر وہ بحث ان کو کہیں ملی نہیں۔

اگلی سطور میں راقم فکر اسلامی کے ان چند مسائل اور ایشوز کی طرف قاری کی توجہ ملتفت کرنا چاہے گا جن میں مفکر نجات اللہ صدیقی دوسرے علما اور اسلامیین سے بالکل الگ ہٹ کر سوچتے تھے۔

مسلم دنیا میں کون سے فکری تغیرات ہو رہے ہیں، مختلف ملکوں میں مختلف شخصیات کن مسائل پر سوچ رہی ہیں اور نئے رجحانات کیا ہیں، اِس پر ڈاکٹر صدیقی کی گرفت اور اطلاع قابل رشک تھی۔ اس معاملہ میں وہ بہت اپ ڈیٹ تھے۔ راقم کے خیال میں ان کی کتاب ـــــ ''اسلام، معاشیات اور ادب: خطوط کے آئینہ میں'' ـــــ میں اسلام کی سیاسی تعبیر کے سلسلہ میں ان کا اضطراب جھلکتا ہے۔ اور اس کے under currents میں وہ فکر مودودی کے متوازی سوچ رہے ہیں، اور بعد کی تحریروں میں یہ چیز اور زیادہ نمایاں ہونے لگتی ہے اور وہ تحریک کی تنگ نائیوں سے نکل کر سوچنے لگتے ہیں۔

حسن اتفاق تھا کہ راقم کا نجات صاحب سے جو interaction ہو، وہ یہی زمانہ ہے۔ علی گڑھ کے ڈاکٹر محمد زکی کرمانی نے ڈاکٹر نجات صاحب سے خصوصی استفادہ کیا ہے۔ ۲۸/ نومبر ۲۰۲۲ء کو ایک آن لائن تعزیتی میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے بھی یہی خیال ظاہر کیا کہ نجات صاحب مولانا مودودی کی غلبہ والی اسلامی فکر سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ اسلام کے احیا کو تو صحیح سمجھتے تھے، مگر غلبہ کو نہیں۔ اور احیا کے لیے بھی علم کا احیا اور نالج پروڈکشن ضروری سمجھتے تھے۔

ان کا خیال تھا کہ تحریک کے لوگ اور عام مسلمان بھی علم کے سلسلہ میں بہت confused ہیں۔ نجات صاحب کے نزدیک علم کے دو مآخذ ہیں: ایک ماخذ وحی ہے، جب کہ دوسرا ماخذ کتاب کائنات ہے۔ علم کا سود مند استعمال مسلمانوں کے عالمی غلبہ کے لیے نہیں، بلکہ عام انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ہونا چاہیے۔ اور اس کے لیے خطرہ اور فتنہ کا رسک لیتے ہوئے بھی آزادی فکر کی ضرورت ہے۔ نجات صاحب سوال کرتے ہیں کہ کیا دنیا کی تشکیل نو اپنی قیادت میں مسلمانوں کی ذمہ داری ہے؟ کیا یہ کافی نہیں کہ دنیا کے سامنے اسلام کو پیش کر دیا جائے؟ اگر غلبہ کا سوال صحیح نہیں تو غلبہ کے مفروضوں کے ساتھ کیوں امت کو manipulate کیا جاتا رہا ہے؟ کیا اگر کوئی تبدیلی آتی ہے تو وہ قدیم زمانہ کی طرف واپسی ہو گی؟ کیا ایسا رجوع مطلوب ہے؟ نجات صاحب

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کہتے تھے کہ ہماری توجہ نتائج سے زیادہ طریقۂ کار پر کیوں ہے؟ ان کو افسوس تھا کہ ساری امت میں اس بات کا چلن ہے کہ مسلمانوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ خود کچھ نہ سوچیں، اسلاف نے سب سوچ لیا ہے؟ انھی کی نظروں سے دیکھا جائے اور انھی کے دماغ سے سوچا جائے؟ یہ ماضی پرستانہ اپروچ نہایت نقصان دہ ہے اور ڈاکٹر نجات صاحب اس پر شدید تنقید کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں، مدارس اور مراکز میں ہر جگہ سارا زور ماضی کے علم پر ہے، نیا علم پیدا کرنے پر کوئی زور نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ امت کے بجاے ہمیں سارے انسانوں کو سامنے رکھنا ہوگا، تبھی اِس دنیا میں ہمارا کوئی relevance بنے گا۔'' اسی طرح جدید اسلامی فکر پر بھی ان کی گہری اور ناقدانہ نگاہ تھی۔ عرب دنیا میں نئے فکری، فقہی اور معاشی رجحانات پر ان کی وسعت نظری قابل رشک تھی۔ اسلامی معاشیات پر ان کی عمیق تحریروں و تراجم کے ساتھ ان کی تخلیقات کی زبان بہت شستہ اور رواں ہے۔

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی یہ سوچتے تھے کہ اسلامی تحریکوں کا زمانہ دوسرا تھا۔ انھوں نے اپنے حصے کا کام کر دیا، آج کی جنریشن کو اپنے حصہ کا کام کرنا ہے۔ مولانا مودودی یا سید قطب کا زمانہ اب ختم ہو گیا۔ آج کے مطالبات دوسرے ہیں، اس لیے آج کے لوگوں کو اجتہاد سے کام لے کر نئی راہیں نکالنی ہوں گی۔ یہ بات صحیح ہے کہ ان کا فکری تعلق جماعت اسلامی سے رہا، لیکن ان کا نقطۂ نظر کبھی بھی جمود پسند نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت میں جو کٹر مذہبیت والا دھڑا ہے، اس نے کبھی ان کے خیالات کی پذیرائی نہیں کی، بلکہ جب ان کی کتاب ''مقاصد شریعت'' شائع ہوئی تو جماعت کی اعلیٰ قیادت کے بعض افراد نے اس کے خلاف مہم چلائی۔ نجات صاحب کے ان خیالات اور آرا کا تذکرہ جماعت اسلامی کے لوگ بھولے سے بھی نہیں کرتے، کیونکہ ان سے جماعت کے پورے ایجنڈے کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اسی طرح ان کا یہ بھی پختہ خیال تھا کہ اسلامی تحریکات کو روایتی علما پر انحصار ختم کرنا ہوگا، اس کے بغیر وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتیں۔

[باقی]

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

۱۱۔ یہ آن لائن تعزیتی پروگرام ۲۸ر نومبر ۲۰۲۲ء کو ہوا تھا، جس میں سامع کی حیثیت سے راقم بھی شریک تھا۔